© rasailojaraid.com

قسط شانزدہم

میرؔ کا سیاسی اور سماجی ماحول

جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب، استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

گذشتہ سے پیوستہ

ادبی مجلسیں اور مشاعرے وغیرہ اٹھارہویں صدی، شمالی ہندوستان میں اُردو زبان کی ترقی اور فروغ کا نہایت سنہری اور اہم دور تھا۔ اگرچہ فارسی سرکاری زبان تھی، اس کا عام رواج تھا۔ مکتبوں اور مدرسوں میں فارسی کی تعلیم برابر جاری تھی۔ فارسی پڑھنا لکھنا، علم و فضل ہی کے لئے نہیں، تہذیب و شائستگی کے لئے بھی لازمی خیال کیا جاتا تھا، لوگ فارسی شعر و سخن کے کتنے دلدادہ تھے اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ اُردو شعراء کے تذکرے اور تمام کتابیں فارسی زبان ہی میں لکھی گئیں، لیکن اردو زبان رفتہ رفتہ فارسی کا مقام حاصل کرتی جا رہی تھی اور فارسی میں کہنے والے شعراء کو بھی بالآخر اس زبان کی طرف مائل ہونا پڑا حالانکہ ابتداء میں انھوں نے اس زبان میں شعر کہنا اپنے لئے کسرِ شان سمجھا اور اس زبان میں شعر کہنے کو فنِ بے اعتبار جانا۔ مصحفیؔ نے ایک جگہ اپنے متعلق لکھا ہے کہ :-

"بمقتضائے رواجِ زمانہ آخر کار خود را مصروف بہ ریختہ گوئی داشتہ برائے ایں کہ رواجِ شعر فارسی در ہندوستان بہ نسبت ریختہ کم است و ریختہ ہم فی زمانہ بہ پایۂ اعلیٰ فارسی رسیدہ بلکہ ازو بہتر گردیدہ"[1]

---

[1] تذکرۂ ہندی - ص ۲۴۸، عقدِ ثریا - ص ۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خانِ آرزو کے بارے میں میر تقی میر نے لکھا ہے :-

"گاہے برائے تفنّنِ طبع دو سہ شعر ریختہ فرمودہ،، ایں فن بے اعتبار" را کہ ما اختیار کردہ ایم اعتبار دادہ اند" [1]

انعام اللہ خاں یقین کا قول ہے :-

کہا نہیں مجھے ریختہ کا خیال ؛ ہوا واجب امر کا امتثال

بخت نے مجھ کو کیا لا جواب ؛ وگرنہ میں اور ریختہ کیا حساب [2]

بہر حال رواجِ زمانہ سے مجبور ہو کر شعراء نے اس زبان کو اپنا لیا اور شعر کہنا شروع کر دیا۔ میر نے اپنے تذکرہ" نکات الشعراء" میں اُن ۱۰۳ شاعروں کا ذکر کیا ہے جو اُردو زبان میں شعر کہتے تھے۔ مصحفی کے "تذکرۂ ہندی" (مصنفہ ۱۲۰۹ھ) میں ۲۷۸ شعراء اور ۵ شاعرات کا ذکر ہے، اسی سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُردو شاعری کو کتنا فروغ حاصل ہو چکا تھا۔ مصحفی نے اپنے فارسی تذکرہ "عقدِ ثریا" (مصنفہ ۱۱۹۹ھ / ۱۷۶۴ء) میں کل ۱۱۹ شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی میں شعر کہنے والوں کی تعداد دن بدن کم ہوتی جا رہی تھی اس کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں کئی اُردو شعراء کے تذکرے، تصنیف ہوئے۔ مثلاً نکات الشعراء، تذکرۂ گردیزی مخزنِ نکات، تذکرۂ شورش، تذکرۂ مسرت افزا۔ تذکرۂ ہندی، ریاض الفصحا، گلزارِ ابراہیم، تذکرۂ عشقی، تذکرۂ شعرائے اُردو (میر حسن دہلوی) مجموعۂ نغز وغیرہ۔

ولی دکھنی کی تقلید میں دہلی کے شعراء مثلاً: آبرو، آرزو، شاکر ناجی، مضمون، میر، سودا، حاتم خواجہ میر درد، مرزا مظہر جانِ جاناں نے پہلے تو تفننِ طبع کی غرض سے اُردو میں شاعری کی، لیکن جب عوام کو اس زبان سے لگاؤ پیدا ہو گیا اور اُردو شاعری کو قبولِ عام حاصل ہوا تو اِن بزرگوں نے اُردو زبان کو صاف ستھرا بنانے کی کوشش شروع کی، چوں کہ اُردو زبان ہندوستان میں پیدا ہوئی تھی لہٰذا اِس پر ہندی الفاظ غالب تھے، شاہ حاتم کو اپنے ابتدائی کلام پر نظرِ ثانی کرنی پڑی کیوں کہ اُس پر ہندی الفاظ کی کثرت تھی جس کی وجہ سے کلام میں ایہام غالب تھا، مختصر یہ ہے کہ خواجہ میر درد۔ مرزا مظہر جان جاناں اور شاہ حاتم نے اُردو زبان

---

[1] نکات الشعراء، تذکرہ ریختہ گویان (گردیزی) ص ۷ - [2] دیوانِ یقین - ص ۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ہندی الفاظ کے بجائے فارسی الفاظ و محاورے داخل کئے۔ طبقۂ سوم کے شعراء کا ذکر کرتے ہوئے شیخ محمد قیام الدین "قائم" نے لکھا ہے کہ :-

"طرزِ کلام ایہا مانا بروبہ فارسی است چنانچہ جمیع شعرے کہ قرارداده اساتذہ اسلاف است بکار می برونند و اکثرے از ترکیبات فرس کہ موافق اُردوئے معلیٰ مانوس گوش می یابند منجملہ جواز الابیان می دانند" لـه

مختصر یہ کہ ان بزرگوں نے اُردو زبان کو پروان چڑھایا اور اس لائق بنایا کہ شرفا بھی اس زبان میں شعر کہہ سکیں کیوں کہ دکھنی زبان ایسی نہ تھی کہ اس میں شعر کہے جا سکتے۔ بقولِ قائمؔ :-

قائمؔ میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
ایک بات لچرسی بزبانِ دکنی تھی

اُردو زبان کی دل فریبی اور ہر دل عزیزی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی سماج کے ہر فرد "ہندو مسلمان" نے اس زبان میں شعر کہنا طرۂ امتیاز سمجھا۔ لہٰذا اس زمانے کے شعراء میں ہر پیشے اور طبقے کے لوگ شاعروں کی فہرست میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً میر اثر، خوش اوقات و نیک سیرت درویشے است، موقّر و صاحب سخنے است مؤثر" عاصمی، درعلمِ تاریخ و شمشیر شناسی و لطیفہ گوئی دستے بہم رسانیدہ، رائے پریم ناتھ "خطاط بے نظیر" آگاہ "بوسیلۂ قصہ خوانی بسر می برد" میر شیر علی افسوس "داروغۂ توپ خانۂ عالی جاہ" حشمت "سپاہی پیشہ" ..... رنگین "سپاہی پیشہ" جوان محمد شاہی "خطِ نستعلیق خوب می نویسد" مہربان خان رند "مجلسے رنگین و بزمِ ارم تزئین داشت" سجاد "درلطیفہ گویان طاق، در ہر امور کہ دخل کردہ بکمال رسانیدہ، علمِ طب ہم حاصل نمودہ..... طلسمات و انشاء، وخوش نویسی و شعر فہمی بمراتبِ اعلیٰ رسانیدہ، شوق "مرد سپاہی پیشہ، صاحبِ دیوان، مدتے در سرکار نواب عماد الملک غازی الدین خان بہادر بوسیلۂ سپہ گری بسر بردہ" شاعر "بزرگ و بزرگ زادہ" نواب عماد الملک غازی الدین خان "بجمیع علوم قادر و درفنونِ سخن ماہر.... ہفت اقلیم و ہفت زبان" فغان "لطائف و ظرائفِ او مشہور است" گریاں "سپاہی پیشہ"

لـه مخزنِ نکات - ص ۳۳ -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وحشت "وصف دار درفنِ سپہ گری استوار" [1]

جوشش نے اپنے ایک شعر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہر شخص شعروشاعری کے میدان میں نظر آتا تھا۔

شاعری کا فن بھی جوشش زورِ فن ہے کچھ نہ پوچھ
ہرکس وناکس نظر آتا ہے اس فن کا حریف [2]

شعروشاعری کا چرچا اتنا عام ہوگیا تھا کہ طفلانِ مکتب بھی بازار سے جاکر شاعروں کا کلام خرید لاتے، اور بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔ کمترین، اپنی غزلیں فروخت کرکے گذر اوقات کرتا تھا۔

قدرت اللہ قاسم کا بیان ہے کہ:-

"اطفالِ مکتب نشین و نوجوان فرحت قرین باشتیاقِ تمام بہ بہائے تمام خرید می کردند" [3]

چوں کہ ہندوستانی سماج کے ہر طبقے کے لوگوں نے شعرگوئی شروع کر دی تھی، لہٰذا ہر شخص نے اپنی طبیعت اور رجحان کے مطابق تخلص بھی اختیار کئے تھے۔ مثلاً اوباش، عیاش، عشاق، کافر، پنچھا، کھو، آرام آزاد، افسوس، افسر، امید، پروانہ، بیدار، دیوانہ، بے ہوش، بے قرار، بیخود، تاباں، پیام وغیرہ [4]

اردو زبان کے فروغ میں بادشاہوں اور امیروں کا حصہ

حالانکہ اٹھارہویں صدی کا سیاسی ماحول ادبی کارناموں اور دلچسپیوں کے منافی تھا۔ پھر بھی شاہانِ مغلیہ اور امرا نے ادبی سرگرمیوں میں پوری دل چسپی لی۔ عہدِ محمد شاہی کا ذکر کرتے ہوئے شاکر خان نے لکھا ہے کہ اس دور میں شیخ علی حزیں، سراج الدین خان آرزو، مرزا مظہر جانِ جاناں، قزلباش خاں، امید، عمدۃ الملک امیر خان انجام، نعمت خان عالی، حکیم شیخ حسین شہرت، میمنت خان فصاحت خاں، معز خاں واجد، علی قلی خان والہ، محمد پناہ قابل، مرزا گرامی، صلابت جنگ غیرت۔ محمد افضل ثابت۔ سید شمس الدین فقیر، میاں فقیہ، مرزا رفیع سودا، میاں حاتم، میاں آبرو، اور علی عظیم پسر ناصر علی مرحوم ادبی مجلسوں کی زینت تھے [5]

[1] برائے تفصیل۔ تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن دہلوی) [2] دیوان جوشش ص ۱۸۱۔ [3] مجموعۂ نغز۔ 17۔ ص ۱۲۴

[4] مجموعۂ نغز، [5] تاریخ شاکر خانی۔ (قلمی) ص ۱۱۱-۱۱۲-

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فردوس آرامگاہ محمد شاہ بادشاہ اور شاہ عالم ثانی[1]، اُردو، فارسی اور ہندی زبان میں شعر کہتے تھے۔

شاہ عالم ثانی، آفتاب تخلص کرتے تھے۔ اُن کا ہندی اور اُردو زبان کا کلام نادراتِ شاہی کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ قدرت اللہ قاسم نے شاہ عالم ثانی کے بارے میں لکھا ہے:۔

"بریں شغل شریف کہ عبارت ازایں کار شعر و شاعری است، فارسی باشد یا ریختہ، سنسکرۃ بودہ خواہ بھاکا اوقات صرف می شود"[2]

وہ شاعروں کی سرپرستی بھی کرتا تھا۔ مصحفی کا بیان ہے کہ:۔

"درآں وقت اکثرے از کبیشران وریختہ گویان پایۂ تخت حاضر می باشند و وقتِ خواندن خوشخوان غلغلۂ تحسین وآفرین بلند می سازند"[3]

سفر و حضر دونوں حالتوں میں بادشاہ کے ہمراہ درباری شعراء ہوتے تھے اور ہر وقت شعر و شاعری کا بازار گرم رہتا تھا۔ اس کے عہد کا "ملک الشعراء" ہونے کا فخر سید الشعراء میر منشی غالب علی خاں سید کو حاصل تھا۔[4] شاہ عالم ثانی نے ایک شاعر کو، جس کا تخلص "شہوت" (پسر شاہ معصوم) تھا۔ مسخر الدولہ قرمساق خان بہادر بھکڑ جنگ کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔[5] خواجہ میر درد نے اِس بادشاہ کی شعراء پروری اور فنِ شاعری کی قدردانی کی تعریف میں ذیل کا شعر کہا ہے:۔

قدردانِ ہنر ہے ذات اس کی ؛ تفصیل سے بھری ہے بات اُس کی[6]

شاہ عالم ثانی کا ولی عہد مرزا جواں بخت، متخلص "جہاں دار" خود بھی شاعر تھا اور شاعروں کی سرپرستی کرتا تھا۔ مہینے میں دو مرتبہ اس کے ہاں مشاعرہ ہوتا تھا اور دہلی کے نامی گرامی شاعر مدعو کیے جاتے تھے[7]

---

[1] سفینۂ ہندی ص ۱۸۰۔ [2] برائے تفصیل۔ مجموعۂ نغز ج ۱۔ ص ۱۹۔ تذکرۂ ہندی۔ ص ۴، تذکرۂ شعرائے اُردو (میر حسن دہلوی) ص ۴۔ [3] تذکرۂ ہندی۔ ص ۴۔ [4] برائے تفصیل۔ وقائع عالم شاہی۔ ص ۶۰-۶۱۔

[5] مجموعۂ نغز۔ ج ۱۔ ص ۳۳۴۔ [6] سنگاسن بتیسی (ق) ص ۸۔ شاہ عالم ثانی کے دربار میں شعر و شاعری کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے فراقی نے لکھا ہے کہ "الحمدللہ کہ ہچو مذکور شعر و شاعری کہ در ہیچ وقتی نشدہ و فہم خاقانی و انوری بداں نرسیدہ، سہلاً در محفل معلیٰ مذکور می شود" ص ۶۱۔

[7] مجموعۂ نغز۔ ج ۱۔ ص ۲۷، تذکرۂ ہندی۔ ص ۶۱، گلشنِ ہند۔ ص ۲۷۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مرشد زادۂ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ تخلص، سلیمان، دہلی سے فرار ہوکر لکھنؤ پہونچا اور وہاں شعر و شاعری کی بساط بچھائی۔ اُس کے دربار سے انشاء، جرأت، سوز اور مصحفی وغیرہ وابستہ تھے۔ اور انعام واکرام سے سرفراز ہوتے تھے، مشاعرہ منعقد ہوتا تھا اور نامی گرامی شعراء بلائے جاتے تھے۔[1]

دہلی کی مرکزی حکومت کے کمزور ہونے کے بعد فرخ آباد، اودھ، مرشد آباد، رام پور، اور ٹانڈہ وغیرہ میں خود مختار صوبائی حکومتیں قائم ہوئیں، دہلی تباہ و برباد ہو چکی تھی، بے روزگاری، طوائف الملوکی اور معاشی تنگی کا بازار گرم تھا۔ فقر و فاقہ کا دور دورہ تھا۔ بادشاہ اور امیر دونوں تنگ حال تھے، خود انہیں اپنا پیٹ بھرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اُن میں اب سکت کہاں تھی کہ شعراء کی پرورش کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہنروروں کی کوئی قدر باقی نہ رہی تھی۔ میرؔ نے شعراء کی بے قدری کی بار بار شکایت کی ہے ؂

صنّاع ہیں سب خوار ازاں جملہ میں بھی

ہے عیب بڑا اُس میں جسے کچھ ہُنر آوے

کیا قدر ہے ریختہ کی گو میں ؂ اس فن میں نظیری کا بدل تھا

بدیں سبب دہلی کے شعراء نے تلاشِ معاش اور سرپرستی اور قدر دانی کی امید میں ان صوبائی حکومتوں کی طرف رُخ کیا جہاں اُن کی امید برآئی اور اُن کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ حسبِ استعداد ان کی قدر دانی ہوئی۔ فرخ آباد کے دربار میں انشاء۔ مصحفی، عظیم بیگ عظیم، فاخر مکین، اور محب علی محب جا کر جمع ہوئے۔[2] ٹانڈہ کے نواب نے مصحفی اور قائم چاندپوری کو پناہ دی۔ رام پور کے نواب فیض اللہ خاں نے اپنے عہد کے شعراء کے سوا قائم چاندپوری کی بھی سرپرستی کی۔[3] لکھنؤ کی سرکار میں سوداؔ، میر اور خان آرزو کے علاوہ دوسرے بہت سے شاعروں کو ملازمت کا شرف حاصل ہوا۔

مختصر یہ کہ بادشاہوں اور امیروں کی سرپرستی اور ہنر پروری اُردو زبان کی ترقی و فروغ میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔ بہت سے امیر فارسی زبان کے علاوہ اردو زبان میں بھی شعر کہتے تھے۔ مثلاً قزلباش خان امید[4]

---

[1] تذکرۂ ہندی۔ ص ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ [2] مجموعۂ نغز۔ ۱۴۔ ص ۸۲، ۸۶، [3] مخزن نکات (مقدمہ) ص ۲۔

[4] نکات الشعراء۔ ص ۷۔ ۸۔ تذکرۂ شعرائے اُردو۔ ص ۲۰۶۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آصف تخلص، نواب وزیر الممالک آصف الدولہ[1]، نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجام[2]، اشرف علی خاں فغاں[3]، نواب یار محمد خان[4] خلف نواب علی محمد خاں روہیلہ، نواب عمدۃ الملک غازی الدین خان[5]۔

دہلی کے مشاعرے یا مراختے[6] سیاسی انتشار، طوائف الملوکی اور تنگ حالی کے ہوتے ہوئے بھی ادبی سرگرمیاں برابر جاری رہیں۔ بقول قدرت اللہ قاسم:-

"از حال ایں زمانہ چہ برطرازم و از قال و مقال ایں دوراں چہ برنگارم کہ دریں ماتم خانہ سینہ چاک نموذہ سیاہ می کند و کاغذ جگر پارہ فرمودہ شکن بر پیشانی می افگند"[7]

لیکن اس پر بھی شہر کے گوشہ گوشہ میں شعر و ادب کے چرچے تھے، قدرت اللہ قاسم لکھتا ہے:

"بہر سو کہ می نگرم شاعرے می بینم و بہر (طرف) کہ گوش فرا می کنم، زمزمۂ شعری شنوم، و طرفہ این ست کہ باہمہ نا اہلیہا ہراک دم از ملک الشعراء می زند و خود را ہمسر بلکہ برتر از دانایان می شمرد"[8]

میر نے اپنے تذکرہ میں مجلس مشاعرہ کے لئے مراختہ یا مجلس ریختہ کا لفظ استعمال کیا ہے[9]

اٹھارہویں صدی کی ادبی سرگرمیوں کی مشاعرے جان تھے۔ خاص طرح سے اہتمام کیا جاتا تھا اور آدابِ مجلس کا پورا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ اِن مشاعروں میں بوڑھے، جوان، بچے اور پیشہ ور لوگ شریک ہوتے تھے اور اچھا کلام سن کر دل کھول کر تحسین و آفرین اور مکرر مکرر کے نعرے بلند کئے جاتے تھے، قدرت اللہ قاسم نے مرزا محمد تقی خان ترقی کے مشاعرہ کا نقشہ اِن الفاظ میں پیش کیا ہے:-

"روزے در مجلس شعراء کہ بخانہ ...... انعقاد یافت، بابسیارے از تلامذہ خود رسیدہ

۱؎ نکات الشعراء، ص ۴۷، تذکرۂ ہندی۔ ص ۱۶۰-۱۵۹- مخزن نکات۔ ص ۴۲ - ۲؎ مخزن نکات۔ ص ۳۲-

۳؎ تذکرۂ ہندی ص ۵- ۴؎ تذکرۂ ہندی۔ ص ۱۳-۱۴- تذکرۂ شعرائے اردو۔ ص ۱۰۶

۵؎ تذکرۂ شعرائے اردو۔ ص ۱۳۷- ۶؎ دہلی میں اردو شاعری کے فروغ و ارتقاء کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لئے ملاحظہ ہو۔ دلی کا دبستانِ شاعری- از ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی- ۷؎ مجموعۂ نغز- ج ۱- ص ۱۴-

۸؎ مجموعۂ نغز، ج ۱- ص ۱۴، نیز ملاحظہ ہو- دستور الفصاحت (یکتا) ص ۱۲۴ ۹؎ نکات الشعراء ص ۱۲، ۱۴۲-

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(جرأت) غزلہا برخواندہ بحدے موردِ تحسین و آفرین خاص و عام گشت کہ شنیدن شعر مشکل شد تا بفہمیدن خود چہ رسد" [1]

نکات الشعراء میں میر نے چھ ایسے اشخاص کا ذکر کیا ہے جن کے ہاں مجلس مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ میر سجاد[2]، میاں صلاح الدین[3] (ان کے ہاں ہر ماہ کی پندرہویں کو مشاعرہ ہوتا تھا) میاں مکترین[4]، میاں علی نقی[5] حافظ حلیم[6] - میر تقی میر - خود بھی ہر ماہ کی پندرھویں کو اپنے مکان پر مشاعرہ کیا کرتے تھے[7] خواجہ میر درد ہر ماہ کی ۲۳ تاریخ کو مشاعرہ کا اہتمام کیا کرتے تھے اور اس میں دہلی کے مشہور و معروف اور مستند شاعر شرکت کرتے تھے - یہ مشاعرہ بعد میں میر کے ہاں ہونے لگا تھا۔[8]

مرزا عبدالقادر بیدل کے عرس کے دن اُن کے مزار پر ایک مشاعرہ ہوتا تھا - بیدل کے تمام شاگرد دہلی کے باذوق اشخاص اور شعراء جمع ہوتے تھے - فاتحہ کے بعد، ان کے شاگرد اور شعراءِ دہلی مزار کے اردگرد حلقہ بناکر بیٹھتے اور یہ رباعی پڑھ کر مشاعرہ کا افتتاح کرتے تھے۔

اے آئینۂ طبع تو ارشاد پذیر ؛ درکسب فوائد نمو اے بے تقصیر
مجموعۂ فکر ما صلاے عام است ؛ سیری کن و بر سمت تسلّی برگیر[9]

نکات الشعراء کے بعد لکھے گئے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو شاعری ترقی کی طرف گامزن تھی، کیوں کہ مشاعروں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی - قدرت اللہ قاسم نے مجموعۂ نغز میں بہت سے مشاعروں کا ذکر کیا ہے۔

درحقیقت یہ مشاعرے اپنی موزونیِ طبع اور استعداد کے مظاہرہ کے اکھاڑے تھے اور اُن کی وجہ سے اُردو شاعری کی ترقی اور فروغ میں بہت مدد ملی - ان مشاعروں کی افادی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے مولوی عبدالحق مرحوم لکھتے ہیں :-

"اس زمانے کی سب سے بڑی علمی اور مہذب مجلسیں مشاعرے تھے۔ جن کے لئے بڑے بڑے اہتمام

---

[1] مجموعۂ نغز ج ۱ - ص ۱۵۵ - ۱۵۶ - [2] نکات الشعراء - ص ۶۲ - [3] ایضاً ص ۸۳، [4] ایضاً ص ۱۴۵ -
[5] ایضاً ص ۱۵۸ - [6] ایضاً ص ۱۵۸ - [7] ایضاً ۵۰ - ۵۱ - ۷۹ - ۸۰، ۱۲۸ - [8] ایضاً ص ۵۰، ۵۱ -
[9] مرقع دہلی - ص ۱۱ - ۱۲ - کلیات سودا - ص ۱۳۰ - خزانۂ عامرہ - ص ۱۵۳ - سفینۂ خوشگو ص ۱۲۱ -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیے جاتے تھے، اس کے خاص خاص آداب تھے، بڑے بوڑھے، نوجوان بچے سب ہی شریک ہوتے تھے۔ باکمال سخنوروں کی دل کھول کے ،، داد دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی بحث مباحثے ہوتے ہوتے لڑائی جھگڑے ہو جاتے اور تھکا فضیحتی تک نوبت پہنچ جاتی تھی، نوجوان اِن مشاعروں میں شریک ہوتے، اور اپنے کانوں سے تحسین و آفرین کے نعرے سنتے تھے۔ جو شعراء کے لئے بڑی داد اور سب سے بڑا انعام تھا، تو اُن کے دل میں امنگ پیدا ہوتی تھی۔ کسی استاد کے پاس حاضر ہوئے، شاگرد ہو گئے، اور شعر کہنا شروع کر دیا۔ گویا شعر کہنے کے لئے صرف کسی استاد کا شاگرد ہو جانا کافی ہے یہ مشاعرے درحقیقت شاعر گر تھے" [1]

میر کی ایک رباعی سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے لکھنؤ کے لئے رخصت ہونے سے قبل ہی دہلی کی علمی اور ادبی مجلسوں پر جمودی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ فکر معاش و تنگ حالی نے لوگوں کے ذہن کو علمی و ادبی مشاغل سے تحصیلِ معاش کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ مشاعروں میں اب وہ پہلی سی رونق باقی نہیں رہی تھی۔

کیا رہا ہے مشاعروں میں اب ÷ لوگ کچھ جمع آن ہوتے ہیں
میر و مرزا رفیع و خواجہ میر ÷ کتنے یہ اک جوان ہوتے ہیں [2]

دہلی میں میر کے احباب میر نے نکات الشعراء میں بہت سے ایسے شاعروں کا تذکرہ کیا ہے جن سے اُن کے براہِ راست تعلقات تھے یا کسی مشاعرہ میں اُن سے ملاقات ہوئی اور رفتہ رفتہ تعلقات بڑھ گئے۔

قزلباش خاں امید [3] ایک دن میر اپنے دوستوں کے اصرار پر حضرت سید حسن رسول نما کے عرس میں شرکت کرنے گئے، وہاں امید بھی موجود ہوئے، اُس پہلی ملاقات کے موقع پر امید نے ریختہ کے دو تازہ کہے ہوئے

میاں شرف الدین مضمون اکبر آباد کے نواح میں واقع قصبہ جاجمؤ کے باشندہ [4] اور سپہ گری پیشہ تھا۔ حریف و ظریف، ہشاش بشاش اور مجلسوں کو گرما دینے والے، حالانکہ شعر بہت کم کہتے تھے، مگر جو شعر

[1] گلشنِ ہند (مقدمہ) ص ۱۷۔ [2] کلیاتِ میر (آسی ایڈیشن) ص ۱۱۰۔ [3] اصلی نام مرزا محمد رضا تھا۔ ہمدان وطن تھا۔ اورنگ زیب کے عہد میں واردِ ہندوستان ہوئے۔ بہادر شاہ نے قزلباش کے خطاب کے ساتھ ہفت ہزاری منصب عنایت کیا۔ ۱۱۵۹ھ میں وفات پائی۔ برائے تفصیل۔ گلشنِ ہند۔ ص ۱۷-۲۲- سفینۂ خوش گو۔ ص ۲۵۰- [4] نکات الشعراء۔ ص ۷۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہتے تھے اس میں بلند پروازی اور جدتِ لفظی بدرجۂ اتم ہوتی تھی۔[1] یہ مضمون کی ضعیفی کا زمانہ تھا۔ جب میر کی اُن سے ملاقات ہوئی۔[2]

محمد شاکر ناجی[3] شاہ جہاں آباد وطن۔ عہدِ محمد شاہی میں سپہ گری کا پیشہ کرتے تھے۔ شعرائے ایہام گو میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ اُن کا دیوان مصحفی کے زمانے تک دہلی میں موجود تھا۔ اشعار دلفریب ہوتے تھے، طبیعت ہزل گوئی کی طرف مائل تھی۔ میر کی اُن سے ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی۔ ہزل کہہ کر سامعین کو ہنساتے تھے لیکن خود کبھی نہیں ہنستے تھے۔[4]

اشرف علی خاں پیام اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔[5] اپنے عہد کے مستند شعرا میں شمار ہوتا تھا۔ ریختہ میں صاحبِ دیوان تھے۔ میر کی اکثر و بیشتر اُن سے ملاقات رہتی تھی۔ اُس موقع پر شعر خوانی اور گپ ہوتی تھی۔[6]

محمد حسین کلیم شاہ جہاں آباد کے باشندے اور سپاہی پیشہ تھے۔[7] ریختہ کے مستند شاعر تھے، قصائد، مخمس اور رباعیات پر مشتمل ایک دیوان ترتیب دیا تھا۔ میر کی اُن سے قرابت داری بھی تھی مگر اس کے قطع نظر وہ میر سے دلی خلوص اور اُنس بھی رکھتے تھے۔ اور اُن کے ساتھ شفقت و مہربانی سے پیش آتے تھے۔[8]

خواجہ میر درد نالۂ عندلیب کے مصنف شاہ محمد ناصر کے بیٹے تھے۔ ابتدا میں سپاہی پیشہ تھے۔ آخر میں مستعفی ہو کر سجادۂ درویشی پر جلوہ افروز ہوئے اور رشد و ہدایت کا شغل اختیار کیا۔ علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھے۔ حالاں کہ اُس زمانے میں دہلی پر آئے دن بلائے ناگہانی اور فتنہ ہائے آسمانی نازل ہوتے رہتے تھے، مگر خواجہ درد ہی دہلی کی بزرگ ہستیوں میں منفرد تھے جنھوں نے ایک دن کے لئے بھی دہلی سے باہر قدم نہ رکھا تھا۔ چوں کہ فنِ موسیقی میں پوری قدرت رکھتے تھے۔ اُس فن کے اکثر استاد اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، ان کا نقشبندیہ

---

[1] نکات الشعرا۔ ص ۲۱۔ گلشنِ ہند۔ ص ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ [2] نکات الشعرا۔ ص ۱۵۔ [3] برائے تفصیل۔ نکات الشعرا۔ ص ۲۲۔ مخزنِ نکات۔ ص ۱۹۔ تذکرۂ ہندی ۲۵۸۔ گلشنِ ہند ۱۷۳۔ [4] نکات الشعرا ص ۲۳۔

[5] برائے تفصیل۔ مخزنِ نکات۔ ۲۲۔ ریاض الفصحا۔ ص ۵۲۔ نکات الشعرا۔ ص ۲۶۔ [6] نکات الشعرا ص ۲۶

[7] مخزنِ نکات۔ ص ۴۳۔ ۴۴۔ تذکرۂ ہندی۔ ص ۱۹۷۔ گلشنِ ہند۔ ص ۱۴۵۔

[8] نکات الشعرا۔ ص ۴۲۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سلسلے سے تعلق تھا لیکن انھوں نے اپنا علیحدہ سلسلۂ محمدیہ مروج کیا۔ تصوف میں کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ اُن کی مشہور تصنیف علم الکتاب ہے۔ ہر ماہ کی دوسری تاریخ کو اُن کے والد کے مزار پر محفلِ سماع منعقد ہوتی تھی۔ اور دہلی کے بیشتر گویئے وہاں حاضر ہوتے تھے[1] میر کو خواجہ درد سے بے حد عقیدت تھی، اُن کے ارشاد پر میر نے اپنے ہاں مشاعرہ شروع کیا تھا چوں کہ نامساعد حالات کی وجہ سے درد نے اپنے ہاں مشاعرہ بند کر دیا تھا[2]

میاں سعادت علی سعادت امروہہ (ضلع مراد آباد) کے سیدوں میں سے تھے[3] سلیم الطبع، کم سخن اور متواضع تھے۔ اُن میں درویشی کی چاشنی بھی پائی جاتی تھی۔ اشعار لطیف ہوتے تھے۔ میر سے اُن کے بہت اچھے تعلقات تھے[4]

میر سجاد اکبر آباد کے باشندے تھے[5] تحصیلِ علم سے شغف تھا۔ اور ریختہ کے اچھے شاعر تھے۔ میاں آبرو[6] کے شاگرد اور شاکر ناجی اور میاں شرف الدین مضمون کے ہم عصر تھے۔ اُن کے کلام میں ایہام پایا جاتا تھا۔ اپنے مکان پر مشاعرہ کا اہتمام کرتے تھے۔ میر اُن مشاعروں میں شرکت کرتے تھے اور یہ ربط و ضبط بہت دنوں تک قائم رہا[7]

میر محتشم علی خان حشمت شاہ جہاں آباد کے باشندے اور میر باقر کے بیٹے تھے۔ دہلی کے محلہ مغل پورہ میں اُن کا مسکن تھا۔ پیشہ سپہ گری تھا۔ آخری زمانے میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ کبھی کبھی کچھ اشعار کہہ لیتے تھے[8] میر کے ساتھ شفقت اور مہربانی سے پیش آتے تھے[9]

کرم اللہ خان درد نواب عمدۃ الملک امیر خان انجام کے بھانجے تھے۔ کلام درد سے لبریز ہوتا تھا۔ طبیعت میں بے حد شوخی تھی۔ میر کی اُن سے ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی[10]

---

[1] برائے تفصیل - میر کی آپ بیتی (فٹ نوٹ) ص ۹۷ - [2] نکات الشعرا - ص ۲۷ - [3] برائے تفصیل تذکرۂ ہندی - ص ۹۲ - ۹۳ - مخزن نکات - ص ۳۸، گلشنِ ہند ص ۹۸ - ۹۹ - [4] نکات الشعراء - ص ۴۹، ۵۱ - ۱۲۸ - [5] مخزن نکات - ص ۲۹ - گلشنِ ہند - ص ۱۱۹ - [6] نکات الشعراء - ص ۹، تذکرہ ریختہ گویان (گردیزی) ص ۸ - مخزن نکات - ص ۱۴ - [7] نکات الشعرا - ص ۶۰ - ۶۱ - [8] مخزن نکات - ص ۲۷ - تذکرۂ ہندی ص ۲۰۶ - [9] نکات الشعراء - ص ۸۳ - [10] ایضاً ص ۷۳ - ۷۴ - مخزن نکات - ص ۴۵ -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میر کے بقیہ احباب کے یہاں صرف نام درج کئے جاتے ہیں۔

اشرف علی خاں فغاں، انعام اللہ خاں یقین، یکرو، شاگرد میاں آبرو، میاں صلاح الدین عرف مکھن۔ محمد اسمٰعیل بیتاب، میاں ثاقب، سید عبدالولی عزلت، میر عبدالحیٔ تاباں، میاں حسن علی شوق محمد قائم، فضل علی دانا۔ محمد عارف، ہدایت اللہ ہدایت، میاں نجم الدین علی سلام، لالہ ٹیک چند بہار میر عبدالرسول نثار، میر حسن حسن، میاں جگن، محمد حسن سلمہ اللہ محسن، بندرابن راقم، میاں ضیاءالدین ضیاء۔ میر علی نقی کافر، میر گھاسی، جیون لال عشاق اور شاغل وغیرہ۔

دلی کے دبستانِ شاعری کا زوال نادر شاہ (۱۷۳۹ء) کے حملے کے بعد سے مغلیہ سلطنت میں زوال اور اختلال کی رفتار تیز تر ہوگئی۔ اور دہلی سے امن و امان اور فارغ البالی مفقود ہو چکی تھی۔ ان حالات میں روزی کی تنگی نے اُن باکمال سخنوروں کو بھی دہلی کو خیرباد کہنے پر مجبور کر دیا۔ جن کے دم سے دہلی، دہلی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایک کر کے اعلیٰ پایہ کے شاعر اور ادیب وہاں سے رخصت ہو لئے، وہ صحبتیں جو شعر و شاعری کی جان تھیں۔ درہم برہم ہو گئیں۔

حسرت عظیم آبادی نے دلی کے دبستان پر ایک مرثیہ لکھا ہے جس کے مطالعہ سے ہماری آنکھوں کے سامنے دہلی کی شعر و شاعری اور اُس کے زوال کا نقشہ آجاتا ہے:-

اس عجم میں جو ہے ہند سو اس میں یہی سخن ؛ کہتے ہیں فارسی کو طور پہ دہلی کے مقیم
جب سے وہ شہر کیا شاہ جہاں نے آباد ؛ وہاں کے باشندوں نے سیکھا سخنِ ہفت اقلیم
پھر تو ایسے ہی سخن سنج ہوئے وہاں کے فصیح ؛ کہ نہ دم مار سکے بلبلِ گلزارِ نعیم
اٹھ گیا سب ولی، ناجی، مضموں کا کلام ؛ شعر صائب کے کریں اُن کے سخن کی تعظیم
پہنچے شیراز میں جیسے سخنِ طوطی ہند ؛ وہاں کے بلبل کا، وٹھا فخر کئے سب تکریم
یہ فلک دیکھ سکا وہاں کی نہ جمعیت کو ؛ لوٹ گئی جوں دلِ عشاق اُسے فوجِ غنیم
جا پڑے وہاں کے سبھی لوگ بیابانوں میں ؛ ہوئے ہر قصبے میں چھوڑ اپنا وطن وہاں کے مقیم
اب سخن اُن کے ہر شخص کو لگتے ہیں عجیب ؛ اہلِ رضواں کے سمجھتے ہیں سخن اہلِ جحیم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شعر جب اُن کا پڑھا جاوے تو مانگیں وہ سند ؛ گفتگو اپنی نہ سمجھیں کہ وہ کتنی ہے سقیم
لفظ نکلے نہ مزاج ان سے کبھی غیر مجاز ؛ زے کا مخرج ہو جہاں بولیں وہ اس جا پر جیم
صبح کو بولیں صبح عقل ہے حیران اس جا ؛ نورِ عرفان کے ایجاد کو سمجھیں نہ ذہیم
چار دو چار کہیں بحر وہ جو سُن پاویں ؛ لفظ 'بت (؟) جو نہ بیٹھے کریں اس کو ترخیم
جانے کیا عیب قوافی کے وہ ایطا اکفا ؛ غیم کا قافیہ پوچھو تو وہ بتلا دیں میم
معنے صد مو رکھیں کرکے وہ مشتق سو کبھی ؛ مولوی جامی سے بھی حل نہ ہو معنیٔ صحدیم
اور کا شعر پڑھا جائے تو تحسیں نہ کریں ؛ اور کہیں پھر پڑھو جیسے کہ سنے کوئی صمیم
بھاری آوے جو انھوں کو تو وہ ہیں کھینچ کر آہ ؛ شعر پڑھنے لگیں روتا ہو کوئی جیسے یتیم [1]

دہلی کے دبستانِ شاعری کے زوال کے دو اہم وجوہ تھے۔

پہلی وجہ تو سیاسی زبوں حالی۔ عام طور پر شعراء دربارِ شاہی یا کسی امیر کی سرکار سے وابستہ تھے۔ اٹھارھویں صدی میں بادشاہ اور امیر دونوں اقتصادی تنگی اور افلاس کے شکار تھے۔ اس بنا پر اب وہ شعراء کی قدردانی کہاں سے کرتے۔ لہٰذا اُنھیں مجبوراً ایسے مقامات کی طرف رُخ کرنا پڑا جہاں اُن کو قدردانی کے ساتھ ساتھ مفلسی اور تنگ دستی سے بھی آزادی حاصل ہو سکتی۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ ابتدائی زمانے میں شاعری کو "فنِ شریف" سمجھا جاتا تھا۔ عوام کو اس میدان میں قدم رکھنے کی مجال نہ تھی۔ لیکن سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے آخری زمانے میں بقول جوشش ہر طبقہ اور پیشہ کے افراد نے اس میدان میں داخلہ حاصل کر لیا۔ بدیں سبب شاعری کا معیار گر گیا۔ اہلِ علم و فن کی قدر جاتی رہی۔ میر اور دیگر شعراء نے اہلِ فن کی خواری کا گلہ کیا ہے۔ شاہ فقیر اللہ آفریں کا ذیلی شعر ملاحظہ ہو:-

عزتی نیست ہنرمند حوادث زدہ را
ہست بے قدر چو آں نسخہ کہ ابتر باشد [2]

---

[1] دیوانِ حسرت (ق) رام پور۔ ص ۵ ب تا ۶ الف۔ اُردو کی ارتقاد کے بارے میں قائم کا مخمس ملاحظہ ہو۔ کلیاتِ قائم (ق) ص ۷۰-۴ب۔ [2] تذکرہ مردم دیدہ۔ ص ۲۸۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۴) مذہب اور اخلاق

اٹھارھویں صدی کی دنیائے اسلام میں مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت پستی اور زوال کے آخری حدوں تک پہونچ گئی تھی۔ بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی :-

"فکر و عمل، اخلاق و عادات، کردار و اطوار سب پر انحطاطی رنگ چھایا ہوا تھا۔ زندگی کے ہر دوام، میں تبدیل ہو رہی تھی اور ہر قوم کو سیاسی زوال سے پہلے اور اُس کے بعد جو اخلاقی زوال کی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں، وہ نہایت سرعت کے ساتھ طے کی جا رہی تھیں۔ اخلاقی قدروں کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی اور سماجی نظام کا سارا ڈھانچہ بگڑ رہا تھا۔ عالم گیر (اورنگ زیب) نے فتاویٰ عالم گیری کی تدوین کرا کر جس گرتے ہوئے اخلاقی اور سماجی نظام کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی وہ اُس کے کمزور اور نااہل جانشینوں کے عہد میں منہدم ہو رہا تھا۔" [۱]

اخلاقی قدروں کے انحطاط کا ذکر کرتے ہوئے اسٹوڈرڈ لکھتا ہے کہ :-

"قرآن کے اخلاقی احکام کی خلاف ورزی ہی نہیں کی جاتی تھی بلکہ اُن کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔ شراب نوشی اور افیون خوری عام تھی۔ فحش کا بازار گرم تھا۔ بدترین افعال بڑی بے شرمی سے اور کھلے بندوں عمل میں آتے تھے۔" [۲]

(باقی)

---

[۱] تاریخِ مشائخِ چشت۔ ص ۳۵۴۔ اسٹوڈرڈ نے لکھا ہے کہ "مذہب بھی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح زوال پذیر تھا۔ حضرت محمدؐ کا بتایا ہوا توحید محض کا تصور توہّمات اور طفلانہ تصوف کی وجہ سے مسخ ہو گیا تھا۔ مسجدیں ویران اور برباد پڑی تھیں ..... جہلا جادو ٹونوں اور تعویذ گنڈوں پر زیادہ اعتقاد رکھتے تھے۔ بزرگوں کے مزارات کی زیارت کو حج کے برابر سمجھتے تھے، اُن کو اپنا شفیع جان کر اُن سے استمداد کرتے تھے۔ چوں کہ (ان کے خیالات کے مطابق) اللہ اُن سے دور اور بزرگوں سے قریب تھا۔"

THE NEW WORLD OF ISLAM (NEW YORK, 1921) P. 26

[۲] THE NEW WORLD OF ISLAM P. 26

© rasailojaraid.com